تدریس قرآن کا مطلوبہ منہاج

محمد عمر اسلم اصلاحی

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نبیوں اور رسولوں کا ایک عظیم سلسلہ قائم کیا اور ہر رسول کو اس کی امت کے لیے اوامر و نواہی پر مشتمل کتاب بھی عنایت فرمائی۔ سب سے آخر میں ختم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ چونکہ آپ ﷺ کی بعثت قیامت تک کے سارے انسانوں کے لیے ہوئی اس لیے آپ ﷺ کو جو کتاب، دستور حیات کے طور پر دی گئی اس میں وسعت بھی ہے، جامعیت بھی ہے اور ابدیت بھی۔ یہ قرآن دنیا کے سارے انسانوں کو اپنا مخاطب بناتا اور ان کی زندگی کے تمام امور و مسائل کا شاندار حل پیش کرتا ہے۔

قرآن کی بنیادی خصوصیات

یہ قرآن انسانوں کو ان کی زندگی کے حقائق سے آگاہ کرتا اور ان کے عقائدی و نظریاتی اختلافات کو رفع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ۔ (النحل/۶۴)	اور ہم نے قرآن تم پر محض اس لیے اتارا ہے کہ تم لوگوں پر وہ چیز اچھی طرح واضح کردو جس میں لوگ مختلف ہوگئے ہیں۔

یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہدایت کا سرچشمہ بن کر نازل ہوا ہے۔

ذٰلِکَ هُدَى اللَّهِ۔ (الزمر/۲۳)	یہ اللہ کی ہدایت ہے۔

البتہ اس قرآن سے ہدایت اسی کو ملے گی جسے اللہ ہدایت کی توفیق بخشے۔

اور جنھیں ہدایت نصیب ہو حقیقی کامران اور فائز المرام وہی ہیں۔ طالبین ہدایت

کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أُولَـٰئِکَ عَلَـی هُـدًی مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَـٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (البقرہ/۵)	یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

یہ قرآن خدا بے زار لوگوں کو آخرت کے نتائج بد سے آگاہ کرتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے یہ اعلان کرایا:

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ۔ (الانعام/۱۹)	اور میری طرف قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ تم کو آگاہ کردوں اور وہ بھی آگاہ کرے جس تک یہ پیغام پہنچا ہے۔

اسی طرح یہ قرآن اہل ایمان کو روز حشر کے حسن انجام کی بشارت بھی دیتا ہے۔

وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ۔ (بنی اسرائیل/۹)	اور یہ اہل ایمان کو بشارت دیتا ہے۔

یہ قرآن اپنے قدردانوں کے دلوں سے ان کے روگ کو دور کرتا اور انھیں رحمت خداوندی کا سایہ فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ۔ (بنی اسرائیل/۸۲)	اور ہم قرآن نازل کررہے ہیں جس میں اہل ایمان کے لیے شفا اور رحمت ہے۔

اور یہ قرآن خطا ونسیان سے مرکب انسان کے بھولے ہوئے اسباق کو یاد دلاتا ہے، اسی اعتبار سے اسے ذکر قرار دیا گیا ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ۔ (یٰسین/۶۹)	یہ تو بس ایک یاد دہانی ہے۔

اور اسی لحاظ سے قرآن کو ذکر سے لبریز کتاب قرار دیا گیا ہے۔

وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ۔ (ص/۱)	قسم ہے ذکر سے لبریز قرآن کی۔

اور اسی غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے آسان، ہموار اور سازگار بنایا ہے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ۔ (القمر/۱۷)	اور یقیناً ہم نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی اس سے ذکر کا فائدہ اٹھانے والا۔

اور یہ قرآن اینچ پیچ سے یکسر محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُرآناً عَربِیّاً غَیرَ ذِیْ عِوَجٍ۔ (الزمر/۲۸)
ہم نے عربی قرآن نازل کیا ہے بے اینچ پیچ کا۔

قرآن کو دستور حیات ماننے والوں نے جب بھی اپنے امور و مسائل میں قرآن سے رجوع کیا ہے انھیں ایسا محسوس ہوا ہے جیسے انہی امور و مسائل کے حل کے لیے قرآن نازل ہوا ہے۔ اس کی ہر تعلیم تازہ اور ہر ہدایت مکمل معلوم ہوتی ہے۔ یہ اختصاص دنیا میں موجود کسی اور کتاب کا نہیں ہے۔ یہ اس باب میں بالکل منفرد کتاب ہے۔

قرآن مجید کی بنیادی حقیقت واہمیت اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کی تعلیم و تدریس کا اہتمام اس پیمانہ پر کیا جائے جس کا وہ بجا طور سے مستحق ہے۔

بحث سے پہلے یہ جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں تدریس قرآن کا کیا منہاج تھا؟ اور وہ منہاج اس وقت کی ضرورت پوری کر رہا تھا یا نہیں؟

تدریس قرآن کا نبوی منہاج

تدریس قرآن کا ایک منہاج تو وہ تھا جو عہد رسالت مآب ﷺ میں تھا کہ قرآن مجید کا جتنا حصہ نازل ہوتا جاتا تھا اللہ کے رسول ﷺ اسے اپنے صحابہ کو سناتے جاتے تھے۔ چونکہ ہر حصہ حالات پر اپنی تعلیمات کے لحاظ سے برسر موقع حاوی ہوتا تھا اور وہ ان کی اپنی ٹکسالی زبان میں ہوتا تھا اس لیے اس کے اندر کی تعلیمات کو وہ اچھی طرح سمجھتے بھی تھے اور اس کے مطابق اپنی عملی زندگی کو ڈھالتے بھی جاتے تھے۔ اس کے علاوہ جب بھی آپ ﷺ اپنے صحابہ کی فکری اور عملی رہنمائی کے لیے ان کے درمیان تذکیر فرماتے تھے تو ان تعلیمات پر مشتمل آیات کی تلاوت بھی فرماتے تھے جو اس صورت حال پر برسر موقع حاوی ہوتی تھیں۔ یہیں سے بعد کے لوگوں کو یہ غلط فہمی بھی ہوگئی کہ فلاں آیات فلاں موقع پر نازل ہوئی ہیں۔ اس طرح اس صورت حال کو انھوں نے ان کی شان نزول قرار دے دیا[1]۔

عہد صحابہؓ میں تدریس قرآن کا منہاج

عہد صحابہؓ میں طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنے اپنے طور پر قرآن مجید کا مطالعہ کرتے تھے مشکل آیات کو اسوۂ نبوی کی روشنی میں اور مشکل الفاظ و اسالیب کو کلام عرب کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے ان کے سامنے ایک طرف قرآن کا یہ بیان تھا کہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (الاحزاب/۲۱) (تمھارے لیے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے) تو دوسری طرف صحبت نبوی سے فیض یافتہ اجلۂ صحابہ کی یہ ہدایت تھی:

> **عليكم ديوانكم لاتضلوا قالوا: ما ديواننا؟ قال شعر الجاهلية. فإن فيه تفسير كتابكم ومعاني كلامكم**[۲]
>
> تم اپنے دیوان کو لازم پکڑو تو گمراہ نہیں ہوگے۔ لوگوں نے پوچھا ہمارا دیوان کیا ہے؟ فرمایا دور جاہلیت کے اشعار ان میں تمھاری کتاب کی تفسیر بھی ہے اور تمھارے کلام کے معانی بھی۔
>
> **الشعر ديوان العرب فإذا خفي علينا الحرف من القرآن الذي انزله الله بلغة العرب رجعنا إلى ديوان ديواننا فالتمسنا معرفة ذلك**[۳]
>
> اشعار عرب کا دیوان ہیں اس لیے جب اس قرآن کے کسی لفظ کا مفہوم ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا جس کو اللہ نے نازل فرمایا ہے تو ہم عربوں کے اشعار سے رجوع کرتے تھے اور وہاں سے اس کی معرفت ڈھونڈ نکالتے تھے۔

یہ طریقہ تو خاص صحابۂ کرام کا تھا جو زبان و ادب پر دسترس رکھتے تھے اور قرآن کے متبحر عالم کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے مثلاً حضرات خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ۔ ان حضرات میں بھی حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا علوم قرآن

میں ایک خاص مقام تھا جنھیں ’’ترجمان القرآن‘‘، ’’حبر الامة‘‘ اور ’’البحر‘‘ کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ انھی ماہرین قرآن میں سے بعض لوگوں کو دور دراز کے علاقوں میں قرآن پڑھانے کے لیے عہد خلفائے راشدین میں بھیجا بھی گیا۔ مثلاً حضرت عبادہ بن صامتؓ کو حمص میں، حضرت معاذ بن جبلؓ کو فلسطین میں اور حضرت ابوالدرداءؓ کو دمشق میں قرآن کے معلم کی حیثیت سے بھیجا گیا۔[۵]

عام صحابہ کرامؓ کا طریقہ یہ تھا کہ دوران مطالعہ جن آیات کو وہ مشکل سمجھتے تھے ان کے سلسلہ میں انھی مذکورہ بالا ماہرین قرآن سے رجوع کرتے تھے اور ان سے ان کے مدلول و مدعا کے بارے میں استفسار کرتے تھے۔

عہد صحابہ کے بعد تدریس قرآن کا منہاج

عہد صحابہؓ کے بعد متعدد علمی شخصیات نے اپنی اپنی مسند درس بچھائی اور اس طرح وہ تشنگان علم کی پیاس بجھاتی رہیں۔ ان میں سے بیش تر لوگ اپنی مکمل درس گاہ کے استاد تھے وہ قرآن، حدیث، فقہ، علم الکلام، ادب و بلاغت اور نحو وصرف سب کچھ پڑھاتے تھے۔ ان کی درس گاہوں کی تدریسِ قرآن کا منہاج یہ تھا کہ طلبہ میں سے کوئی خوش الحان قاری قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا، استاد اس پر تقریر کردیا کرتا تھا اور اثنائے تقریر میں اسلام کے مخالفین اور معترضین کے سوالات واعتراضات کے جواب بھی دیتا جاتا تھا اور ان آیات سے جو مسائل مستنبط ہوتے تھے ان کی وضاحت بھی کرتا جاتا تھا۔[۶]

ان علمی شخصیات میں حضرت مجاہد، حضرت سعید بن جبیر، حضرت عکرمہ، حضرت طاؤس، حضرت عطا بن ابورباح، حضرت سعید بن مسیّب، حضرت محمد بن سیرین، حضرت زید بن اسلم، حضرت ابوالعالیہ اور حضرت حسن بصری رحمہم اللہ وغیرہ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔

ان حضرات کی درس گاہوں میں تدریس قرآن کا وہ رنگ باقی نہیں رہا جو عہد صحابہ میں تھا۔ ان میں فہم قرآن کے لیے اسوۂ نبوی اور کلام عرب سے استشہاد کو وہ اہمیت

حاصل نہیں رہی جو عہد صحابہ تک ان کی تھی ان کی جگہ احادیث و آثار نے لے لی تھی اور کم و بیش یہی منہاج تدریس شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے زمانہ تک قائم رہا۔ شاہ صاحب نے ایک بار پھر قرآن کو مرکزیت دینے کی کوشش کی لیکن اس کا اثر ان کی اولاد و احفاد سے آگے نہیں بڑھ سکا چنانچہ اسی عہد میں ملا نظام الدین نے درس نظامیہ کی بنیاد رکھی اور انھوں نے تدریس قرآن کے لیے جلالین کا انتخاب کیا اور یہی جلالین مدارس میں عام طور پر پڑھائی جانے لگی۔ لیکن چونکہ شاہ صاحب کے عہد تک فہم قرآن کے لیے احادیث و آثار کو جتنی اہمیت حاصل ہوگئی تھی اس کے لیے جلالین کفایت نہیں کر رہی تھی اس لیے مدارک التنزیل اور تفسیر بیضاوی کو بھی داخل درس کیا گیا اور ادب و بلاغت کے پہلو کو بھی تدریس کا حصہ بنانے کے لیے کشاف پڑھائی جانے لگی لیکن جب اس سے بھی تسکین کا سامان نہیں ہوا تو تفسیر شوکانی اور بعد میں تفسیر ابن کثیر کو جزو نصاب بنانے کی وکالت کی گئی جو اب جاکر قابل قبول ہوئی۔ اس وقت بھی تمام مدارس میں قرآن کی تعلیم و تدریس انہی تفسیروں کے گرد گھوم رہی ہے صرف چند مدارس اس سے مستثنیٰ ہیں جن میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تدریس قرآن سے وابستہ افراد کو یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ عہد نبوی ﷺ اور عہد صحابہؓ میں تدریس قرآن کا جو بھی نظام قائم تھا اس میں تفہیم آیات قرآنی کے لیے قرآن کی مماثل آیات، اسوۂ نبوی، علمائے اہل کتاب کے تاریخی بیانات اور نظم کلام کی روشنی میں کلام عرب سے استشہاد کا پہلو غالب تھا جو بعد کے ادوار میں باقی نہیں رہا[6]۔ اس لیے تدریس قرآن کے منہاج کو پھر سے اس پٹری پر لانے کی ضرورت ہے۔

اب جب کہ یہ احساس ابھر رہا ہے کہ رجوع الی القرآن کے بغیر مسائل حیات کا حل ممکن نہیں ہے تدریس قرآن کے اس منہاج کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے قرآن مجید ایک بار پھر اپنی پوری اہمیت کے ساتھ جلوہ گر ہو اور دنیا کے تمام علوم و معارف کا صدر نشیں بن جائے اور دنیا قرآن کے بارے میں عملاً اس بات کا ثبوت فراہم کرے کہ ''صدر ہر جا کہ نشیند صدر است''۔

تدریس قرآن کا مطلوبہ منہاج

تدریس قرآن کا وہی منہاج موثر اور مفید ہوسکتا ہے جس میں تین پہلوؤں کا بیک وقت لحاظ رکھا گیا ہو اور مدرس قرآن کو چاہیے کہ ان تینوں پہلوؤں کو ہمیشہ پیش نظر رکھے ورنہ ہزار اہتمام کے باوجود یہ مثل صادق آئے گی کہ ''از دیدہ دور از دل دور''۔

ایک پہلو

اس کا ایک پہلو علمی اور تحقیقی ہے۔ اس علمی اور تحقیقی پہلو کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے مفرد الفاظ کی تحقیق کی جائے، اسالیب پر نظر رکھی جائے تاویل آیات کے سارے اصول سامنے رکھے جائیں، نظم کلام کی مکمل رعایت رکھی جائے، تفسیر کرتے وقت پہلے خود قرآن سے رجوع کیا جائے، الفاظ، محاورات، استعارات اور کنایات کو کلام عرب کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے پھر احادیث و آثار سے رجوع کیا جائے، گزشتہ قوموں کے ان احوال و کوائف کو جن کی طرف قرآن نے محض اشارہ کیا ہے قدیم آسمانی صحیفوں کی مدد سے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے، مہبط وحی اور اس کے ماحول سے واقفیت بہم پہنچائی جائے اور قدیم و جدید مفسرین کی آراء و تحقیقات سے استفادہ کیا جائے۔

دوسرا پہلو

اس کا دوسرا پہلو تعلیمی اور تذکیری ہے۔ یعنی قرآن کی روشنی میں عقائد و نظریات کا جائزہ لے کر صحیح عقیدہ و نظریہ کی ترجمانی کی جائے، ایمانیات کی وضاحت کی جائے۔ طلبہ کے سامنے پوری صراحت کے ساتھ یہ بات رکھی جائے کہ قرآن اخلاقیات، معاملات، معاشرت، معیشت اور حکومت و سیاست کے لیے کون سا معیار متعین کرتا ہے۔ ہماری عملی زندگی میں کن امور کی کیا اہمیت ہے؟ اور کن احکام کی کیا حیثیت ہے؟

تیسرا پہلو

اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ مدرس قرآن اس بات کو ہمیشہ ذہن نشیں رکھے کہ اگر

اس کا کردار قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہے تو طلبہ پر ان تعلیمات کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ کہنے کی حد تک ممکن ہے یہ بات درست ہو کہ ”یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے“، لیکن عملی دنیا میں اس فلسفہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سامع یا مخاطب ہمیشہ قائل کے قول اور معلم کی تعلیم کو اس کے عمل کی میزان پر تولتا ہے اس کے بعد وہ اسے قبول یا رد کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کی تعلیمات نے معاشرہ پر جو مثبت اثر ڈالا ہے اس میں قول کے ساتھ عمل کا مثبت اثر بھی ہے۔

میرے نزدیک یہ تینوں پہلو منہاج تدریس ہی کا حصہ ہیں، انھیں یکساں طور سے اہمیت دی جانی چاہیے ورنہ تدریس قرآن نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگی۔ اب ہم ذیل میں ان میں سے ہر ایک کی قدرے تفصیل سے وضاحت کریں گے تاکہ مقصود کلام منقح ہو کر سامنے آجائے۔

علمی و تحقیقی منہاج

اللہ تعالیٰ نے جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے اسے اسی زبان میں کتاب ہدایت بھی دی ہے جس زبان کے جاننے والے مخاطب تھے، تاکہ وہ کتاب ہدایت کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت ہر چند کہ سارے عالم کے لیے ہوئی لیکن آنحضرت ﷺ کے مخاطب اول چونکہ عرب تھے اس لیے آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید کی زبان عربی رکھی گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

بے شک ہم نے اس کو عربی قرآن کی صورت میں نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو۔	إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ (یوسف/۲)
اور یہ واضح عربی زبان ہے۔	هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ۔ (النحل/۱۰۳)

جب یہ قرآن عربوں کی اپنی زبان عربی مبین میں نازل ہوا ہے تو اس میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معانی بھی وہی ہوں گے جو عربوں کے ہاں معروف رہے ہوں گے۔ اگر قرآن مجید میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معانی اس سے مختلف ہوتے

جو ان کے ہاں مراد لیے جا رہے تھے تو اس پہلو سے ان کا اعتراض قرآن مجید پر ضرور وارد ہوا ہوتا جب کہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس طرح کا کوئی اعتراض انھوں نے کبھی نہیں اٹھایا بلکہ وہ قرآن کے کلام بلاغت نظام کی عظمت اور اس کی فصاحت و بلاغت کے پوری طرح قائل تھے۔ اس لیے قرآنی الفاظ کے معانی کو سمجھنے کے لیے کلام عرب کے تتبع کی سخت ضرورت ہے۔ یہ تتبع صرف عجمیوں کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ عربوں کے لیے بھی ضروری ہے اس ضرورت کا احساس حضرات صحابۂ کرامؓ کو بھی تھا جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے اور اب تو اس کی ضرورت اور بھی دو چند ہوگئی ہے کیوں کہ عربوں کی موجودہ زبان اس ٹکسالی عربی زبان سے بہت مختلف ہے جو زمانۂ نزول قرآن میں ان کی تھی۔ بسا اوقات لفظوں کے صحیح معنیٰ و مفہوم کے مخفی رہ جانے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ آیت کا صحیح مدعا سامنے نہیں آتا بلکہ اس کے بجائے اس کا کوئی ایسا مفہوم مراد لے لیا جاتا ہے جو نہ تو قرین قیاس ہوتا ہے اور نہ اس سے کلام الٰہی کا زور ہی سمجھ میں آتا ہے اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ بات بے جوڑ سی ہو جاتی ہے، تو پھر یہ کہا جانے لگتا ہے کہ قرآن میں نظم کی تلاش ایک بے معنیٰ سی بات ہے جیسا کہ متعدد مفسرین نے کہا بھی ہے۔ مثلاً قرآن مجید کی ایک آیت ہے۔

مفردات کی تحقیق

وَنَزَعْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيداً فَقُلْنَا
هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ
وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ۔
(القصص/۷۵)

اور ہم ہر امت سے ایک گواہ کھینچ نکالیں گے اور ان سے کہیں گے کہ لاؤ اپنی دلیلِ شرک تب ان کو پتہ چلے گا کہ حق تو اللہ کے لیے ہے اور ہوا ہو جائیں گے وہ جن کو وہ اللہ کے مقابلہ میں گھڑ کر پیش کرتے تھے۔

اس آیت میں دو الفاظ کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک ‘‘نزع’’ دوسرے ‘‘شہید’’۔ ‘‘نزع’’ کے اصل معنیٰ کھینچنے یا کھینچ نکالنے کے ہیں۔ یہی معنیٰ تمام معتبر لغات میں بھی ہے اور کلام عرب سے بھی اسی معنیٰ کی تائید ہوتی ہے۔ خود قرآن مجید نے اسے

متعدد مقامات پر استعمال کیا ہے اور ہر جگہ اسی معنیٰ میں استعمال کیا ہے ے۔ لیکن پتہ نہیں کیسے عام طور پر مفسرین نے اسے "أخرجنا" کے معنیٰ میں لے لیا ہے یعنی نکالنا اور اٹھا کر کھڑا کرنا، نتیجہ یہ ہوا کہ آیت اپنے سیاق وسباق سے کٹ گئی۔

اس آیت سے پہلے آیت ۷۴ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین کی جماعت کو پکار کر ان سے کہے گا کہ تم لوگوں نے دنیا میں میرے شریک ٹھہرا رکھے تھے۔ آج ان شرکاء کا دیدار مجھے بھی کراؤ جن کو تم میرا شریک گمان کرتے تھے میں بھی ان کی خدائی کے کرشمے دیکھوں چنانچہ فرمایا:

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ۔ (القصص/۷۴)

اور یاد کرو اس دن کو جس دن وہ (اللہ) ان (مشرکوں) کو پکار کر کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شرکاء جنھیں تم نے معبود گمان کر رکھا تھا۔

اس کے بعد وہ آیت آئی ہے جس میں "نزعنا" اور "شہید" کا استعمال ہوا ہے، کہ جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملے گا تو ہم مشرکوں کے ان قائدین کو مجمع سے کھینچ نکالیں گے جو شرک کے علم بردار رہے ہیں اور آج دبکے چلے جا رہے ہیں اور ان سے کہیں گے کہ لاؤ پیش کرو دلیل شرک۔ آخر کس دلیل کی بنیاد پر تم نے لوگوں کو ہمارے بجائے ان دیویوں اور دیوتاؤں سے جوڑ رکھا تھا تب ان کی سمجھ میں آئے گا کہ یہ تو برا ہوا۔ قرآن اس بات کو یوں نقل کرتا ہے۔

وَنَزَعْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيداً فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ۔ (القصص/۷۵)

اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھینچ نکالیں گے اور ان سے کہیں گے کہ لاؤ اپنی دلیل شرک۔ تب ان کو پتہ چلے گا کہ حق تو اللہ کے لیے ہے اور ہوا ہو جائیں گے وہ جن کو وہ اللہ کے مقابلہ میں پکارتے تھے۔

اس کے بعد قوم موسیٰ کے اسی طرح کے ایک سرکردہ لیڈر قارون کا ذکر آیا ہے

جولوگوں کی تنبیہ اور یاددہانی کے باوجود اپنی روش سے باز نہ آیا بلکہ اس نے خدائی قوت کو چیلنج کرتے ہوئے اکڑفوں دکھائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَى فَبَغَى عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ۔ (القصص/۷۶)

بے شک قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا تو اس نے ان کے خلاف سر اٹھایا اور ہم نے اس کو اتنے خزانوں کا مالک بنا رکھا تھا کہ اس کی کنجیاں ایک طاقت ور گروہ سے مشکل سے اٹھتی تھیں جب کہ اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا کہ اتراؤ مت۔ اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں سیاق وسباق بھی اس معنیٰ کے حق میں نہیں ہے جو عام طور سے بیان کیا جاتا ہے اور لفظ ''نزع'' کے اندر بھی اس معنیٰ کی گنجائش نہیں ہے۔ غالباً لفظ شہید سے لوگوں کو دھوکا ہوگیا حالاں کہ اس لفظ کا استعمال قرآن مجید میں جس طرح ایک داعی دین کے لیے ہوا ہے اسی طرح ایک داعی کفر وشرک کے لیے بھی ہوا ہے۔ اس لیے محض اس لفظ کی بنیاد پر ایک لفظ کا معنیٰ اس طرح نہیں بدل دینا چاہیے کہ تجاوز عن حد اللفظ ہوجائے۔

اس لفظ کا استعمال داعی دین کے لیے اس آیت میں ہوا ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا۔ (النساء/۴۱)

اس دن ان کا حال کیا ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے نبی!) ہم تم کو ان لوگوں کے خلاف گواہ بنا کر پیش کریں گے۔

اور داعی کفر وشرک کے لیے یہ آیت ملاحظہ ہو۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِن شَهِيدٍ۔ (حٰم السجدہ/۴۷)

اور اللہ جس روز ان مشرکوں کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے شرکاء تو وہ کہیں گے کہ ہم تو تجھے بتا چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی اس کا گواہ نہیں ہے۔

اسالیب پر نظر

اسی طرح کا معاملہ اسالیب کا بھی ہے۔ قرآن مجید دراصل اللہ تعالیٰ کا ساری انسانیت کے سامنے ایک خطاب ہے۔ اس نے اس میں کہیں تو صرف اہل ایمان سے خطاب کیا ہے اور کہیں صرف اہل کفر و شرک سے، کہیں صرف اہل نفاق سے تو کہیں اہل نفاق اور اہل ایمان دونوں سے۔ اسی طرح کہیں اہل ایمان اور اہل کفر و شرک دونوں سے۔ تدریس قرآن کے وقت اسلوب خطاب اور مخاطب کا ادراک ضروری ہے۔ ورنہ کلام کے رخ کو متعین کرنے میں سخت دشواری ہوگی۔ خطاب کے اسلوب ہی سے پتہ چلتا ہے کہ کہاں تسلی وطمانیت کا پہلو ہے اور کہاں زجر و توبیخ کا؟ کلام کا کون سا حصہ رافت پر مبنی ہے اور کون سا غضب پر؟ کہاں وعدہ ہے اور کہاں وعید؟ کہاں خطاب ہے اور کہاں التفات؟ کہاں فصل ہے اور کہاں وصل؟ کہاں تکرار ہے اور کہاں بدل؟ کہاں تعمیم ہے اور کہاں تخصیص؟ کہاں مقابلہ ہے اور کہاں تفصیل؟۔

اسلوب پر نظر نہ رہے تو صحیح نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل ہے۔ مثلاً سورۂ عبس کی ابتدائی آیات دیکھیے ان کی تفسیر کرتے ہوئے عام طور سے مفسرین نے لکھا ہے کہ اس میں ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ کے ساتھ بے اعتنائی برتنے پر نبی کریم ﷺ پر عتاب ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ نبی آخر الزماں اور ان پر عتاب! جن کی فرض شناسی اور قوم کی طرف شدت اعتنا کا یہ حال تھا کہ انھیں اپنے سکھ اور آرام کی بھی فکر نہیں اور جن کے شوق دعوت اور رغبت تبلیغ کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو یہ فرمانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ عَلَی آثَارِهِمۡ إِن لَّمۡ يُؤۡمِنُوا بِهَٰذَا الۡحَدِيۡثِ أَسَفاً۔ (الکہف/٦)	لگتا ہے کہ تم ان کے پیچھے اپنے آپ کو مارے افسوس کے ہلاک کرڈالو گے اگر یہ اس بات پر ایمان نہ لائے۔
لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ أَلَّا يَکُونُوا مُؤۡمِنِيۡنَ۔ (الشعراء/٣)	معلوم ہوتا ہے تم اپنے آپ کو ہلاک کرڈالو گے کہ وہ ایمان نہیں لا رہے ہیں۔

پھر اگر ایسا ہوا بھی کہ سرداران قریش کے درمیان ان کی آمد سے اللہ کے رسول ﷺ کو کچھ کبیدگی ہوئی بھی تو یہ کبیدگی معاذ اللہ اس وجہ سے تو نہیں ہوسکتی کہ وہ ایک معمولی انسان اور نابینا تھے، بلکہ اس لیے ہوئی کہ بے وقت ان کی آمد سے میرے اس مشن کو دھچکا لگا جس کا میں لوگوں کو قائل بنا رہا تھا۔ اگر ایسا ہے تو یہ ناگواری جس جذبۂ خیر کے ساتھ ہوئی اس پر آپ ﷺ مستحق عتاب تو نہیں تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ شوق دعوت وتبلیغ میں اپنی پیغمبرانہ شان کی رعایت نہیں رکھ سکے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے، آپ ﷺ تنبیہ کے سزاوار ہوئے اور یہاں ہے بھی محض تنبیہ اور اس تنبیہ میں بھی آپ ﷺ کے تئیں اللہ تعالیٰ کی رافت ورحمت صاف جھلک رہی ہے۔ البتہ اسلوب میں جو شدت اور گرمی ہے اس کا رخ سرداران قریش کی طرف ہے۔ یہ تو زبان کا ایک بڑا معروف اسلوب ہے کہ بظاہر مخاطب کسی اور کو بنایا جاتا ہے اور بات کسی اور سے کہی جاتی ہے۔ یہ اسلوب بالعموم تکلیف یا نفرت کے وقت اختیار کیا جاتا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ یہاں سرداران قریش کے بجائے رسول کو مخاطب ان سرداروں سے نفرت اور بے زاری کے اظہار کے طور پر بنایا گیا ہے۔

اس اسلوب سے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ کو یہ معلوم ہوگیا کہ ہٹ دھرموں کی خاطر دردمندوں کا دل نہیں توڑا جاسکتا۔ دوسرے کفار ومشرکین کو یہ احساس دلا دیا گیا کہ تم راہ راست پر آنے کو تیار نہیں ہو تو اللہ یا رسول کو اس کی بہت زیادہ پرواہ نہیں ہے اس سے ان کا نہیں بلکہ تمہارا اپنا نقصان ہے۔

اسی طرح کبھی کبھی بتقاضائے ایجاز کوئی جملہ حذف کردیا جاتا ہے لیکن کلام میں کوئی حرف ایسا ڈال دیا جاتا ہے جو اس محذوف کی طرف اشارہ کردیتا ہے۔ یہ بھی عربی زبان کا ایک خاص اسلوب ہے، اب اگر یہ اسلوب پیش نظر نہ رہے تو اسی طرح کی غلطی ہوگی جس طرح کی غلطی عام طور سے علمائے تفسیر نے کی ہے، مثلاً قرآن مجید کی ایک آیت ہے:

لِئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَلَّا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ (الحدید/۲۹)

اس کا ترجمہ عام طور سے مفسرین ومترجمین نے یہ کیا ہے۔

’’تا کہ اہل کتاب جان لیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتے۔‘‘

اس ترجمہ میں "لئلا" کے ’’لا‘‘ کا ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ مترجمین اس ’’لا‘‘ کو زائد مانتے ہیں اور اس کی دو دلیلیں دیتے ہیں۔ ایک عقلی اور ایک نقلی۔ عقلی دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ’’لا‘‘ کو زائد نہیں مانتے تو بات الٹی ہو جائے گی۔ چنانچہ کہتے ہیں:

وتزاد بعد "أن" المصدرية كقوله لئلا يعلم أهل الكتاب، ليعلم ولولا تقدير زيادة "لا" يعكس المعنى۔ [8]

اور ’’لا‘‘ ان مصدریہ کے بعد زائد ہے جیسے لئلا یعلم **أهل الكتاب** دراصل لیعلم ہے۔ اور اگر یہاں ’’لا‘‘ کو زائد نہیں مانتے تو معنیٰ الٹ جائے گا۔

اور نقلی دلیل کے طور پر تمام مفسرین کا اتفاق اور سیبویہ کو پیش کرتے ہیں جو امام نحو ہے، لکھتے ہیں:

واما زيادة لا في قوله لئلا يعلم اهل الكتاب فشئ متفق عليه قد نص عليه سيبويه۔ [9]	اور اللہ کے قول "لئلا یعلم أهل الکتاب" کا ’’لا‘‘ باتفاق علماء زائد ہے اور اس پر سیبویہ کا نص بھی موجود ہے۔

اس آیت کا مفہوم متعین کرنے میں جو زحمت پیش آئی ہے وہ صرف اس اسلوب کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے جس کا ذکر ابھی اوپر ہوا۔ جو تاویل عام طور سے مفسرین نے کی ہے اس پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس ’’لا‘‘ کو لانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کیوں نہیں اسے بغیر ’’لا‘‘ کے استعمال کیا گیا۔ جیسا کہ قرآن میں متعدد مقامات پر استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً:

لِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ۔ (النحل/۳۹)	تا کہ کافر جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔

دراصل آیت زیر بحث میں ایک جملہ محذوف ہے جس کی طرف ’’لئلا‘‘ کا ’’لا‘‘

اشارہ کر رہا ہے۔ اگر اس محذوف کو کھول دیا جائے تو عبارت یوں ہوگی۔

لئلا يعلم أهل الكتاب انهم يقدرون على فضل الله إنهم لايقدرون على شئ من فضل الله۰[۱]

تا کہ اہل کتاب یہ نہ جان لیں کہ وہ اللہ کے فضل پر اختیار رکھتے ہیں وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر بھی قادر نہیں ہیں۔

اس طرح کے سیکڑوں اسالیب ہیں جن کو قرآن کی علمی اور تحقیقی تدریس میں ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

تاویل آیات کے اصولوں پر نظر

علم اصول تاویل بھی ایک مستقل علم ہے۔ ایک مدرس قرآن کو اس علم سے بھی واقفیت ہونی چاہیے۔ اصول تاویل وہ اصول ہیں جو فہم قرآن میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں اور یہ دو طرح کے ہیں۔

ایک تو وہ ہیں جو تاویل کے باب میں کج روی سے حفاظت کرتے ہیں۔

دوسرے وہ ہیں جو ان حکمتوں کی جانب رہنمائی کرتے ہیں جن پر کلام الٰہی مشتمل ہے۔

اصول تاویل کے تین اساسی حصے ہیں:

۱- بنیادی اصول، ۲- ترجیحی اصول، ۳- باطل اصول

بنیادی اصول

بنیادی اصول سے مراد وہ اصول ہیں جن کی حیثیت اصل الاصول کی ہے، جن کے بغیر آیات کی صحیح تاویل تک رسائی ممکن ہی نہیں۔ یہ اصول چار ہیں:

۱- نظم کلام اور سیاق و سباق کی رعایت۔

۲- شاذ معانی سے اجتناب۔

۳- قرآن کی تفسیر قرآن سے۔

۴- خطاب اور مخاطب کا تعین۔

ان چاروں اصولوں میں بعض کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے اور بعض کا آگے آ رہا ہے، اس لیے ان کی تفصیلات یہاں نظر انداز کی جاتی ہیں۔

ترجیحی اصول

ترجیحی اصول سے مراد ایسے اصول ہیں جن کی مدد سے مختلف احتمالات کی صورت میں صحیح معنیٰ تک رسائی میں سہولت ہوتی ہے اور وہ پانچ ہیں:

۱- کلام کی مختلف توجیہات کی امکانی صورت میں اس مفہوم کو ترجیح حاصل ہوگی جو موقع و محل اور عمود کلام سے زیادہ مناسبت رکھتا ہو، ہر کلمہ کے کچھ اطراف و جہات ہوتے ہیں جن کی حیثیت معانی کی ہوتی ہے اسی طرح ہر امر واقعہ اور قصہ کے بھی کچھ اطراف و جہات ہوتے ہیں ان کی رعایت کے بغیر اس امر واقعہ یا قصہ کو صحیح طور سے سمجھنا مشکل ہے۔ مثلاً کئی سورتوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں لیکن ان تمام سورتوں میں انبیاء کی ترتیب یکساں نہیں ہے کہیں ترتیب زمانی ہے تو کہیں ترتیب صفاتی اور کہیں محض مخاطب کی رعایت سے دو ایک پیغمبروں کا ہی ذکر ہے۔ جو لوگ ان انبیائی قصوں کے اطراف و جوانب کو نہیں سمجھتے وہ انبیائے کرام کی اس قرآنی ترتیب پر اعتراض کرتے ہیں جیسا کہ مشہور یہودی عالم گائیگر نے اپنی کتاب ''یہودیت اور اسلام'' (JUDAISM AND ISLAM) میں کیا ہے[11]۔

دراصل جب اہل کتاب کے ساتھ گفتگو ہوتی ہے تو ان کے لیے کبھی حضرت سلیمان و داؤد علیہما السلام کے قصے سنائے جاتے ہیں اور کبھی حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے۔ اسی طرح ان کی تذکیر کے لیے خود ان ہی کی تاریخ دہرائی جاتی ہے لیکن جب مخاطب مشرکین عرب ہوتے ہیں تو اس وقت اگرچہ تھوڑی بہت واقفیت کی بنا پر بعض اور انبیاء کا بھی ذکر کر دیا جاتا ہے لیکن زیادہ زور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات پر دیا جاتا ہے اور ان کی تذکیر کے لیے یہود و نصاریٰ کی تاریخیں نہیں دہرائی جاتیں بلکہ قوم لوط،

قوم عام اور قوم ثمود وغیرہ کے حالات بیان کیے جاتے ہیں کیوں کہ یہ لوگ ان کے حالات سے باخبر تھے جیسا کہ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے نیز تجارت کے سلسلہ میں ان کا گزر اکثر ان قوموں کے تباہ شدہ مقامات پر ہوا کرتا تھا اسی لیے سورۂ صافات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اور تم کبھی صبح کو کبھی رات کو ان کی بستیوں پر گزرتے ہو تو کیا اس کے باوجود نہیں سمجھتے۔	وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِم مُّصْبِحِيْنَ. وَبِاللَّيْلِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۔(۱۳۷-۱۳۸)

سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے۔

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی ہوئی نشانیاں دیں۔	وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِن بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ ۔(البقرہ/۸۷)

اس سورہ میں روئے سخن زیادہ تر اہل کتاب کی طرف ہے اس لیے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا اور بیچ میں تمام انبیاء کو چھوڑ کر اور صدیوں کا سفر ایک لمحہ میں طے کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر پہنچ گئے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جن کے لیے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ ہی کا تذکرہ زیادہ مؤثر اور مفید ہوگا۔ سورۂ صافات میں کفار عرب کے انذار اور آنحضرت ﷺ کی تسلی کے لیے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارون، حضرت الیاس، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کے حالات بیان کیے گئے ہیں لیکن صرف حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ مفصل ہے۔ باقی تمام انبیاء کا تذکرہ صرف چند آیتوں میں ختم کر دیا گیا۔ کیوں کہ یہاں مخاطب کے اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ ہی کے قصہ کی تفصیل مناسب تھی۔ سورۂ شوریٰ میں مشرکین عرب اور اہل کتاب دونوں کی طرف روئے سخن ہے جیسا کہ بعد کی آیتوں سے واضح ہوتا ہے اس لیے وہاں حضرت نوحؑ کے بعد صرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کا نام لیا گیا[۱۲]۔

یہ اور اس طرح کی حکمتوں کی معرفت کے لیے ترجیحی اصول کو جاننا بہت ضروری ہے۔

۲- کلام میں اگر متعدد احتمالات ہوں تو اس احتمال کو ترجیح حاصل ہوگی جس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہو۔ اور جس کی نظیر قرآن مجید میں موجود نہ ہو اسے ترک کر دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر دو معانی کا احتمال ہو اور دونوں کی نظیریں قرآن مجید میں موجود ہوں تو اسی احتمال کو ترجیح حاصل ہوگی جو نظم کلام کے مطابق ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ (الانفال/۲۴)

اس آیت کی دو تاویلیں ہوسکتی ہیں:

ایک تاویل تو یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ تمھارے رازہائے سربستہ سے واقف ہے۔

اور دوسری تاویل یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آدمی کو اس کے ارادے سے روک دیتا ہے۔

پہلی تاویل کی نظیر بھی قرآن مجید میں موجود ہے اور نظم کلام بھی اسی کی تائید کرتا ہے کیوں کہ "تحشرون" کا تصور دل میں اللہ کا تقویٰ پیدا کرتا ہے، اسی لیے متعدد مقامات پر اس کا ذکر تقویٰ کے ساتھ ہوا بھی ہے مثلاً:

وَاتَّقُوْا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ (البقرہ/۲۰۳)

وَأَنْ أَقِيْمُوْا الصَّلَاةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِیْ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ (الانعام/۷۲)

وَاتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِیْ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ (المجادلۃ/۹)

اور تقویٰ پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے تصور علم سے۔ تو گویا بات یہاں یہ کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو کیوں کہ وہ تمہارے رازہائے سربستہ سے بخوبی واقف ہے اور تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

رہی دوسری تاویل تو نظیر اس کی بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ سورۂ سبا میں ہے: وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ۔ (۵۴) لیکن اس موقع پر سیاق کلام اس کی تائید نہیں کرتا[۱۳]۔

۳- اگر معنیٰ کسی ایسی عبارت کا مقتضی ہو جو کلام میں مذکور نہیں تو یہ مرجوح ہوگا۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جسے اصولی طور سے عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لیے مثال دینے کی ضرورت نہیں۔

۴- ہمیشہ کلام میں احسن پہلو کو ترجیح حاصل ہوگی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو احتمال معالی امور اور مکارم اخلاق کے شایان شان ہو، دل اسے بلا تامل قبول کرتا ہو، محکمات قرآنی کے مطابق ہو، اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ حسن ظن پر مبنی ہو اور عربیت کے لحاظ سے زیادہ نمایاں ہو تو وہ قابل ترجیح ہوگا۔ مثلاً سورۂ یوسف کی ایک آیت ہے: **لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ** ۔ (۱۱۱) اس کی ایک تاویل تو یہ ہوگی کہ اے مکہ والو! اگر تم عقل و بصیرت سے کام لو تو قصہ یوسفؑ میں تمھارے لیے عبرت، کا سامان موجود ہے۔ دوسری تاویل یہ ہوگی کہ قصۂ یوسفؑ میں یوسف اور ان کے بھائیوں کے لیے خاصا سامان عبرت موجود ہے۔ سیاق کلام پہلی تاویل کے حق میں ہے جب کہ دوسری تاویل کے حق میں ایک روایت ہے جو مجاہدؒ سے مروی ہے۔ امام ابن جریر طبریؒ تفسیر بالماثور کے نمائندہ مفسرین میں سے ہیں۔ لیکن وہ بھی فرماتے ہیں کہ اس تاویل کا بھی ایک محل ہے جو تاویل ہم نے اوپر کی ہے وہ اس سے بہتر ہے[۱۴]، کیوں کہ محمد ﷺ اور ان کی مشرک قوم کے حالات بیان کرنے اور مشرکوں کے شرک و کفر پر وعید اور تہدید کے بعد یہ فرمایا گیا ہے کہ ''**لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ**[۱۵]۔

۵- کسی لفظ کے اس معنیٰ کو ترجیح حاصل ہوگی جو لغت کے لحاظ سے زیادہ ثابت شدہ ہو کیوں کہ جو معنیٰ کلام عرب میں زیادہ مستعمل ہو اسے نظر انداز کرنا درست نہیں ہے، مثلاً ایک لفظ ہے ''الشویٰ'' جو سورۃ المعارج (۱۶) میں استعمال ہوا ہے، اس کے تین معانی مترجمین نے لیے ہیں۔ شاہ عبدالقادر دہلوی سے پہلے کے لوگوں نے عام طور سے اس کا معنیٰ ''جلد الراس'' بتایا ہے۔ شاہ صاحب نے اسے ''کلیجہ'' کے معنیٰ میں لیا ہے اور بعض لوگوں نے ''لحم الساق'' کے معنیٰ میں۔ ان میں سے پہلے دو معانی کے لیے معتبر لغات خاموش ہیں۔ البتہ تیسرا معنیٰ تمام مستند لغات میں ملتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ ایک

نیا معنیٰ ؛ سے پہنا دیا جائے۔ اگر الفاظ کے معانی میں اسی طرح حد سے تجاوز کیا جائے تو نہ منشائے قرآن باقی رہنے پائے گا نہ منشائے حدیث۔

باطل اصول

ایسے تمام اصول باطل ہیں جو قرآن و سنت کی روح کے منافی ہوں۔ ایسے اصول کا پتہ لگانے کے لیے قرآن و سنت کا گہرا مطالعہ ناگزیر ہے۔

سطور بالا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تدریس قرآن کے لیے علم اصول تاویل کی کتنی اہمیت ہے۔

نظم کلام کی رعایت

منہاج تدریس قرآن کا انتہائی اہم اور بنیادی عنصر نظم کلام ہے، کیوں کہ نظم کلام صحیح تاویل تک پہنچانے میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ نظم کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورہ کا ایک خاص عمود ہے اور اس سورہ کی تمام آیات نہایت حکیمانہ مناسبت کے ساتھ اس عمود سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب سورہ کا عمود اور مرکزی مضمون سامنے ہوتا ہے تو آیات کی تاویل میں غلطی کا امکان کم رہتا ہے اس طرح ایک سورہ متفرق احکام و ہدایات پر مشتمل مجموعۂ آیات کے بجائے ایک نہایت حسین وحدت نظر آتی ہے پھر کئی سورتیں مل کر ایک گروپ بنتا ہے اور جس طرح ہر سورہ کا ایک عمود ہوتا ہے اسی طرح ہر گروپ کی تمام سورتوں میں ایک منطقی اور تدریجی ربط ہوتا ہے اور تمام گروپوں کے مضامین میں بھی منطقی اور تدریجی ربط ہے۔ ان تمام گروپ کے مجموعہ کا نام قرآن ہے اور خود قرآن کا بھی ایک مرکزی موضوع ہے، البتہ مدرس قرآن کو یہ بات نظر میں رکھنی چاہیے کہ قرآن مجید کا نظم کتابی نہیں بلکہ خطابی ہے۔ کیوں کہ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے ان خطابات کا مجموعہ ہے جو انسانوں کے سامنے حالات و ظروف کے لحاظ سے کیے گئے ہیں۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں نظم تلاش کرنے کے

لیے ہر چند کہ بالکل یکسو ہونا پڑتا ہے اور ان آیتوں اور سورتوں میں ڈوبنا پڑتا ہے لیکن تکلف سے کام ہرگز نہیں لینا پڑتا بس ان اصولوں کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے جو خطابی نظم کا ناگزیر حصہ ہیں۔

میں مولانا امین احسن اصلاحی کی اس رائے کو درست مانتا ہوں کہ قرآن مجید کے سات گروپ ہیں، سورۃ الفاتحہ کی حیثیت تو مقدمۂ قرآن کی ہے اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی حیثیت تتمہ کی۔ باقی سورتوں کے گروپ مع موضوعات اس طرح ہیں:

پہلا گروپ: سورۃ البقرۃ تا سورۃ المائد: موضوع: دعوت ایمان
دوسرا گروپ: سورۃ الاعراف تا سورۃ التوبہ: موضوع: اسلامی عقائد کی توضیح
تیسرا گروپ: سورۃ یونس تا سورۃ النور: موضوع: حق و باطل کی کشمکش اور غلبۂ حق
چوتھا گروپ: سورۃ الفرقان تا سورۃ الاحزاب: موضوع: اثبات رسالت
پانچواں گروپ: سورۃ سبا تا سورۃ الحجرات: موضوع: اثبات توحید
چھٹا گروپ: سورۃ ق تا سورۃ التحریم: موضوع: اثبات آخرت
ساتواں گروپ: سورۃ الملک تا سورۃ الاخلاص: موضوع: انذار

اب ان گروپوں کے مضامین کا باہمی ربط دیکھیے:

بندگان خدا کے سامنے پہلے دعوت ایمان آنی چاہیے کیوں کہ ایمان بنیاد ہے اس اسلام کی جسے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے، اس لیے پہلے گروپ کا موضوع ''دعوت ایمان'' رکھا گیا۔

جب دعوت ایمان لوگوں کے سامنے آجائے گی تو فطری طور سے ذہن میں یہ سوال ابھرے گا کہ اسلام جس ایمان کی دعوت دے رہا ہے اس کے خدوخال کیا ہیں؟ اور وہ کن بنیادی عقائد پر مشتمل ہے؟ اسی لیے دوسرے گروپ میں اسلامی عقائد کی توضیح پر توجہ دی گئی۔

جب اسلامی عقائد کی توضیح سامنے آجائے گی تو یہ کیوں کر ممکن ہوگا کہ باطل اسے ٹھنڈے پیٹ برداشت کرلے، اس لیے کش مکش حق و باطل ناگزیر ہے، اس کش مکش

میں فتح کس کی ہوگی اور شکست سے دوچار کون ہوگا؟ اس کی بھی وضاحت ضروری تھی اس لیے تیسرے گروپ کا موضوع یہی رکھا گیا۔

اسلامی عقائد کے جو تین بنیادی ستون ہیں-توحید، رسالت اور آخرت- ان کے باب میں قدیم اہل مذاہب کے یہاں بڑا تضاد اور تناقض ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ ان کے بے آمیز تصور کو لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے۔ اس کے بغیر تکمیل دین ممکن نہیں تھی۔ اس لیے ان موضوعات کے بعد جن کا اوپر ذکر ہوا انہی تینوں بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ ان پر خصوصی توجہ دی گئی اور ان کو قرآن کے بیچ میں اسی لیے رکھا گیا کہ یہ آگے اور پیچھے اسی طرح روشنی بکھیریں جیسے بیچ کا چراغ چاروں طرف روشنی بکھیرتا ہے۔ ان عقائد کی ترتیب کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے توحید کا ذکر کیا جاتا پھر رسالت کا اس کے بعد آخرت کا۔ لیکن چونکہ توحید تک رسائی رسول کی ذات بابرکات کے بغیر ممکن نہیں اس لیے پہلے رسالت کو موضوع بحث بنایا گیا، جو چوتھے گروپ کا موضوع ہے۔

پھر توحید کو جو پانچویں گروپ کا موضوع ہے۔

اس کے بعد آخرت کو جو چھٹے گروپ کا موضوع ہے۔

اور چونکہ ہر سماج میں کچھ ہٹ دھرم اور ڈھیٹ لوگ ہوتے ہیں جو دعوت وتبلیغ میں ترغیب وتشویق کی زبان نہیں سمجھتے تو ایسے لوگوں کے لیے تہدید اور تخویف کی زبان موثر ہوتی ہے، اس لیے آخر میں انذار کو موضوع بحث بنایا گیا۔

غور کیجیے کہ ایک کتاب زندگی اور دستور حیات میں اس سے بہتر تدریجی ربط اور کیا ہوسکتا ہے؟ اتنا ہی نہیں بلکہ اگر تدبر کی نظر ڈالیے تو صاف محسوس ہوگا کہ اب کوئی ایسا بنیادی موضوع باقی نہیں بچا ہے جس سے حیاتِ انسانی کا راست تعلق ہو۔

یہ تو ہوا ساتوں گروپس اور ان کے موضوعات کے باہمی ربط کا تذکرہ۔ ٹھیک اسی طرح ہر گروپ کی تمام سورتوں اور ان کے مضامین میں بھی گہرا منطقی اور تدریجی ربط ہے۔ البتہ سورتوں کے نظم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہر سورہ کے اقتباسات کو الگ الگ کیجیے پھر دیکھیے کہ ان اقتباسات میں نظم و ربط ہے یا نہیں۔ جن لوگوں نے تلاش نظم کو

تکلف بے جا قرار دیا ہے اگر ان کی تحریروں کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے سورتوں کے اقتباسات کو الگ الگ کر کے غور نہیں کیا ہے۔ اس لیے انھیں نظم نظر نہیں آیا۔ مثلاً ایک سورہ ملاحظہ ہو:

سورۂ حدید کا مرکزی موضوع انفاق فی سبیل اللہ ہے، اس میں کل گیارہ چھوٹے چھوٹے اقتباسات ہیں۔

پہلے اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ معلم انفاق کوئی اور نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عظیم ہستی ہے۔

دوسرے اقتباس میں بتایا گیا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ اسلام کا ایک اہم اور بنیادی ستون ہے۔

تیسرے اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ حالات کے لحاظ سے انفاق کی اہمیت کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے۔

چوتھے اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ انفاق کا اصل فائدہ آخرت میں ملے گا۔

پانچویں اقتباس میں ہے کہ انفاق حشر کے روز ایک خاص قسم کا نور عطا کرے گا۔

چھٹے اقتباس میں ہے کہ انفاق کے باب میں اہل کتاب کی روش سے گریز ضروری ہے۔

ساتویں اقتباس میں ہے کہ انفاق سے مرتبہ بلند ہوتا ہے۔

آٹھویں اقتباس میں ہے کہ انفاق سے جی چرانے والوں کا کردار افسوس ناک ہے۔

نویں اقتباس میں ہے کہ فقر وغنا کا تعلق انفاق و امساک سے نہیں بلکہ تقدیر الٰہی سے ہے۔

دسویں اقتباس میں ہے کہ انفاق کو ہدف ملامت نہ بناؤ۔

اور گیارہویں اقتباس میں ہے کہ انفاق فضل الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔

ان کا باہمی تدریجی ربط و نظم بالکل واضح ہے اس لیے مزید کسی گفتگو کی ضرورت نہیں۔ یہ سارے مضامین ۲۹ آیات میں بیان ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ بعض مضامین ایک

سے زائد آیتوں پر مشتمل ہیں۔ اب اگر ایک مضمون کی آخری آیت کا نظم دوسرے مضمون کی پہلی آیت سے تلاش کیا جائے گا تو ان میں جو باہم نظم و ربط ہے اور نہ ملے گا، اس لیے ضروری ہے کہ نظم کی تلاش بھی نظم کے اصولوں کی روشنی میں ہی کی جائے۔ ان اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھنا مدرس قرآن کے لیے ازبس ضروری ہے۔

یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ قرآن انسان کے باطن کی صدا، اس کی روح کا نغمہ اور اس کی فطرت کا ترانہ ہے لیکن یہ ساری خصوصیات اسی صورت میں نظر آئیں گی جب اس کے اندر ایک خاص قسم کا ربط و نظم ہو اور وہ ربط بھی منطقی اور تدریجی ہو ورنہ اس کا صدائے باطن، نغمۂ روح اور ترانۂ فطرت ہونا تو کجا اس کے کلام بلاغت نظام ہونے کا دعویٰ ہی ایک مضحکہ خیز دعویٰ قرار پائے گا۔ اس لیے منہاج تدریس میں اسے ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے شامل کرنا چاہیے۔

تفسیر القرآن بالقرآن

تقریباً تمام ہی مفسرین اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ تفسیر کے لیے سب سے پہلے قرآن ہی سے رجوع کرنا چاہیے۔ کیوں کہ قرآن ایک ہی معاملہ کو مختلف مواقع پر ان کے موقع و محل کے لحاظ سے الگ الگ انداز میں پیش کرتا ہے۔ کہیں اس کا ایک پہلو ہوتا ہے تو کہیں اس کا دوسرا پہلو، اسی طرح کہیں اجمال ہوتا ہے تو کہیں تفصیل اور کہیں تفصیل مزید۔ اس حقیقت کی وضاحت قرآن نے خود کردی ہے اسی اعتبار سے وہ کتاب متشابہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتَاباً مُّتَشَابِهاً۔ (الزمر/۲۳)

جو باہم دگر مشابہ ہے۔

اسی حقیقت کو دوسری جگہ تصریف آیات سے تعبیر کیا ہے، فرمایا:

اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ لَعَلَّهُمۡ يَفۡقَهُوۡنَ۔ (الانعام:۶۵)

دیکھو کہ کیسے ہم آیتوں کو مختلف پیرائے میں بیان کرتے ہیں تا کہ لوگ سمجھیں۔

مثلاً سورۂ بقرہ میں یہود کے دو گروہوں کا بیان ہوا ہے، ایک گروہ کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلاَمَ اللّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔ (البقرہ/۷۵)	ان کا ایک گروہ تو وہ ہے جو اللہ کے کلام کو سنتا رہا ہے اور اس کو سمجھ لینے کے بعد اس میں تحریف کرتا رہا ہے حالاں کہ وہ خوب جانتے ہیں۔

دوسرے گروہ کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

مِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لاَ يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلاَّ أَمَانِيَّ۔ (البقرہ/۷۸)	اور ان کی ایک جماعت امی ہے یہ لوگ کتاب کو نہیں جانتے، بس کچھ آرزوئیں ہیں جو انھوں نے پال رکھی ہیں۔

ان دونوں آیتوں کے الفاظ اور اسالیب سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ پہلا گروہ یہود و نصاریٰ کے علماء کا ہے اور دوسرا گروہ ان کے عوام کا لیکن دوسری آیت میں جو ''أمانی'' یعنی آرزوؤں کا ذکر ہے۔ اس کی کوئی تفصیل یہاں موجود نہیں ہے۔ اب اگر قرآن کے دوسرے مقامات پر نظر نہ ڈالی جائے تو ''أمانی'' کا سراغ ممکن نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ دیگر ان مقامات کو دیکھا جائے جہاں ان کا ذکر ہے، چنانچہ ایک جگہ ان کا یہ خیال نقل کیا گیا ہے کہ چونکہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں اس لیے آخرت میں ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں، گویا بزعم خویش أبناء اللہ وأحباءہ'' ہونے کی وجہ سے وہ یہ امید رکھتے ہیں کہ اللہ ان کے ساتھ خصوصی رعایت کا معاملہ کرے گا، ان کی اس آرزوئے خام کا ذکر سورۃ المائدہ میں یوں ہوا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاء اللّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ۔ (۱۸)	اور یہ یہود و نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ (ہمارا کیا مسئلہ؟)۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال خام کے جواب میں اپنے پیغمبر سے یہ کہلوایا:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم۔ (المائدہ/۱۸)

ان سے پوچھو کہ پھر اللہ ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں سزا کیوں دیتا رہا ہے؟۔

اور پھر مختلف مقامات پر ان سزاؤں کی تفصیل بھی بیان کی ہے، مثلاً پوری قوم کی غلامی، پوری قوم کی صحرا گردی اور ان کی اجتماعی جلاوطنی وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب دنیوی سزائیں ہی تھیں۔

اسی طرح ان کی اس آرزوئے خام کا بھی ذکر کیا کہ ان کا خیال یہ ہے کہ اولاً تو کوئی سزا ہمیں ہوگی ہی نہیں اور اگر بفرض محال اللہ تعالیٰ دوسروں کی زبان بند کرنے کے لیے ہمیں جہنم میں ڈال بھی دے تو جلد ہی اس سے نکال بھی لے گا کیوں کہ وہ اپنے بیٹوں اور چہیتوں کو لمبی سزا نہیں دے سکتا۔ قرآن نے ان کا یہ خیال یوں نقل کیا ہے۔

وَقَالُواْ لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلاَّ أَيَّاماً مَّعْدُودَةً۔ (البقرہ/۸۰)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔

اسی طرح ان کا ایک خیال خام یہ تھا کہ جنت میں صرف ہم ہی جائیں گے۔ جنت ہمارے لیے ہی بنی ہے۔

وَقَالُواْ لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلاَّ مَن كَانَ هُوداً أَوْ نَصَارَى ۔ (البقرہ/۱۱۱)

اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف یہود و نصاریٰ ہی جائیں گے۔

آگے قرآن نے خود واضح کر دیا ہے کہ یہ ان کی جھوٹی آرزوئیں ہیں جو کبھی پوری ہونے والی نہیں۔ فرمایا:

تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۔ (البقرہ/۱۱۱)

یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں۔

یا مثلاً ایک آیت ہے: وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالإِبْكَارِ (آل عمران/۴۱) اور شام اور صبح اللہ کی تسبیح کرو۔ اس صبح و شام کے اطراف و جوانب کا پتہ لگانا ہے تو اس مضمون کی دوسری آیات دیکھنی ہوں گی۔ مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ کیجیے پتہ چل جائے گا کہ صبح و شام کی وسعتیں کیا ہیں؟

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰى۔ (طٰہٰ/۱۳۰)	اور اپنے رب کی تسبیح کرو اس کی حمد کے ساتھ سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی تاکہ تم نہال ہو جاؤ۔
وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ. وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ۔ (ق/۳۹-۴۰)	اور اپنے رب کی تسبیح کرو اس کی حمد کے ساتھ سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات میں اس کی تسبیح کرو اور سجدوں کے پیچھے۔
وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِيْنَ تَقُومُ. وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ۔ (الطور/۴۸،۴۹)	اور اپنے رب کی تسبیح کرو جس وقت تم اٹھتے ہو اور رات کو بھی اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے پیچھے ہٹنے کے وقت بھی۔
فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُونَ وَحِيْنَ تُصْبِحُونَ. وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِيْنَ تُظْهِرُونَ۔ (الروم/۱۷-۱۸)	تو اللہ کی عظمت و کبریائی کا اعلان و اظہار کرو جب تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو اور آسمانوں اور زمین میں حمد اسی کے لیے ہے اور تیسرے پہر اور جب تم ظہر کرتے ہو۔
أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ۔ (ھود/۱۱۴)	نماز قائم کرو دن کے دونوں حصے میں اور رات کے کچھ حصے میں۔
أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوکِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُودًا. وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّکَ عَسَى أَنْ يَبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُودًا۔ (بنی اسرائیل/۷۸-۷۹)	نماز قائم کرو سورج ڈھلنے کے بعد سے رات کی تاریک ہونے تک اور خاص کر فجر کی قرأت مشہود ہوتی ہے اور رات کو تہجد پڑھو یہ نفل ہے تمھارے لیے۔ امید ہے کہ تمھارا رب تم کو مقام محمود پر کھڑا کرے گا۔

ان تمام آیات کو سامنے رکھیے تو "**تسبیح بالعشی والابکار**" کی وسعتوں کا پتہ چل جاتا ہے، پھر انہی آیات سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہاں تسبیح سے اشارہ بطور خاص نماز کی طرف ہے اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ تمام نمازوں میں تہجد کی کیا حیثیت ہے؟ اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ مقام محمود تک رسائی کے لیے نماز کی کیا اہمیت ہے؟ اگر ان ساری آیات کو سامنے نہ رکھا جائے تو **تسبیح بالعشی والابکار** کی نہ تو حقیقت معلوم ہوگی اور نہ اس کی اہمیت اور حیثیت۔

تفسیر القرآن بالاحادیث والآثار

قرآن کی کسی آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو اس کی مماثل یا اس مضمون پر متضمن آیات پر ہی نظر ڈالنی چاہیے اور اگر وہ آیات اس کے مفہوم اور اطراف و جوانب کو منقح کر دیتی ہیں تو خواہ مخواہ کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر اس مضمون کی تائید میں احادیث و آثار کو بھی بیان کر دیا جائے تو یہ بہتر ہے لیکن اگر نفس مضمون کے تمام گوشوں کو مماثل اور متعلق آیات واضح نہیں کر رہی ہیں تو دیکھنا چاہیے کہ نفس مسئلہ کیا ہے؟ اگر اس کا تعلق مخصوص اصطلاحات یا تشریعی احکام سے ہے تو احادیث و آثار سے ان کی تفصیلات معلوم کرنی چاہئیں۔ اب اگر احادیث و آثار اس چیز پر متفق ہیں تو جو تصویر ان کے ذریعہ سامنے آئے اس کو قبول کر لینا چاہیے اور اس پر ویسے ہی عمل کرنا چاہیے جیسے قرآنی آیات پر عمل کیا جاتا ہے لیکن اگر روایات میں اختلاف ہو تو اس روایت کو ترجیح دی جانی چاہیے جو مزاج دین سے ہم آہنگ اور مسلمات عقل سے متصادم نہ ہو۔ بالفاظ دیگر روایات کو درایت کی کسوٹی پر ضرور پرکھنا چاہیے۔ ہمیں اس سے اختلاف نہیں کہ محدثین نے اس کی تحقیق میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے لیکن محدثین کی تحقیق کو کتاب و سنت کا درجہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآن مجید جس دین کی سب سے بنیادی کتاب ہے وہ دین، دین فطرت ہے۔ اس لیے وہ کوئی غیر فطری نظام نہیں پیش کر سکتا۔ لیکن اگر نفس مضمون کا تعلق بنی اسرائیل کے ان احوال سے ہوتا ہے

جن کا قرآن نے حوالہ دیا ہے تو قدیم آسمانی صحیفوں سے رجوع کرنا چاہیے اور ان صحیفوں میں جو چیزیں قرآن کے موافق نظر آئیں ان سے یقیناً استشہاد کرنا چاہیے اور اگر اہل کتاب کی تحریفات کو قرآن کی روشنی میں نمایاں کیا جا سکے تو اور بھی بہتر ہوگا تا کہ طلبہ بھی ان سے واقف ہو سکیں۔

عام طور سے تفسیر کے حوالہ سے دو نظریوں کا ذکر کیا جاتا ہے ایک تفسیر بالماثور دوسرا تفسیر بالرای۔ تفسیر بالماثور کو ضروری اور تفسیر بالرای کو یکسر غلط قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ افراط و تفریط سے خالی نہیں، کیوں کہ تفسیر بالماثور وہ تفسیر ہے جو نبی کریم ﷺ، حضرات صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین کی طرف منسوب روایات پر مشتمل ہو اور تمام اہل علم جانتے ہیں کہ ان بزرگوں کی طرف منسوب تفسیری روایات کا ایک حصہ اسرائیلیات کا ہے۔ کیا ان اسرائیلیات سے استدلال ضروری اور ان سے عدم استدلال انکار حدیث ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ جہاں تک صحیح روایات کا تعلق ہے تو وہ قرآن مجید سے متصادم ہو ہی نہیں سکتیں۔ بھلا اللہ کے رسول ﷺ سے زیادہ قرآن کو سمجھنے والا کون ہو سکتا ہے؟

اور تفسیر بالرای یہ ہے کہ سلف سے مروی روایات کو تفسیر کی بنیاد بنانے کے بجائے براہ راست غور و فکر کا سہارا لے کر آیات کا مفہوم متعین کیا جائے۔

تفسیر بالرای قطعی طور سے مردود نہیں ہے، اس رائے کا اظہار سلف میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کا شمار تفسیر بالرای کے بڑے ناقدین اور تفسیر بالماثور کے علمبرداروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے خود تفسیر بالرای کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔

۱- تفسیر بالرای المذموم ۲- تفسیر بالرای المحمود

تفسیر بالرای المذموم وہ تفسیر ہے جو یکسر آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہو، لیکن تفسیر بالرای المحمود وہ تفسیر ہے جو زبان کے قواعد، آیات کے نظائر، سنت سے گہری واقفیت اور اللہ کی عطا کردہ بصیرت پر مشتمل ہو، صحابۂ کرامؓ کی تفسیریں بھی اسی نوعیت کی ہیں وہ تمام آیات قرآنی کو روایات سے سمجھنے کے بجائے روایات کا جائزہ آیات کی روشنی میں لیتے

تھے۔ حضرت عائشہؓ سے جب رویت الٰہی کے متعلق حدیثیں بیان کی گئیں [۱۷] تو انھیں ان کے قبول کرنے میں تامل ہوا اور انھوں نے یہ آیت تلاوت کی۔

لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار [۱۸]
اس کو نگاہیں نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اس حدیث کو کہ ''مردہ پر نوحہ کرنے سے اسے قبر میں عذاب ہوتا ہے'' یہ کہہ کر رد فرما دیا کہ:

لاتزر وازرۃ وزر أخری [۱۹]
کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

اب امام ابن تیمیہؒ کا تفسیر بالرای کے باب میں تبصرہ ملاحظہ کیجیے۔ فرماتے ہیں:

فاما تفسیر القرآن بمجرد الرای فحرام۔ [۲۰]

محض رائے کی بنیاد پر قرآن کی تفسیر حرام ہے۔

ولھٰذا تحرج جماعۃ من السلف عن تفسیر مالا علم لھم بہ۔ [۲۱]

اور اسی لیے سلف میں سے کچھ لوگوں نے ایسی تفسیر کو نامناسب خیال کیا ہے جس کی بنیاد علم پر نہ ہو۔

آگے مزید فرماتے ہیں:

فھٰذہ الآثار الصحیحۃ وماشاکلھا عن أئمۃ السلف محمولۃ علی تحرجھم عن الکلام فی التفسیر بما لا علم لھم بہ فاما من تکلم بما یعلم من ذلک لغۃ وشرعا فلا حرج علیہ۔ [۲۲]

چنانچہ یہ اور اس طرح کے دوسرے آثار صحابہ جو ائمۂ سلف سے منقول ہیں اس بات پر محمول کیے جائیں گے کہ دراصل انھوں نے ان لوگوں کے لیے تفسیر کے باب میں لب کشائی کو نامناسب خیال ہے جنھیں فن تفسیر کا سرے سے کوئی علم ہی نہیں رہے وہ لوگ جنھیں اس باب میں زبان و شریعت کا علم حاصل ہے تو ان کے کلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ تفسیر بالرای کو یکسر مذموم قرار دینے والوں کو امام ابن تیمیہؒ کی اوپر والی رائے تو نظر آتی ہے اور اسے بالعموم نقل بھی کرتے ہیں لیکن نیچے والی رائے نظر نہیں آتی، علاوہ ازیں تفسیر بالرای کو یکسر غلط قرار دینے والے بالعموم اصحاب معاذؓ سے مروی یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں۔

> **ان رسول الله ﷺ بعث معاذا إلىٰ اليمن فقال: كيف تفضي؟ فقال: أقضي بما فى كتاب الله. قال: فإن لم يكن فى كتاب الله ؟ قال فبسنة رسول الله، قال: فإن لم يكن فى سنة رسول الله؟ قال: اجتهد برائى، قال: الحمد لله الذى وفق رسول رسول الله (صلى الله عليه وسلم)** [۲۳]۔
>
> کہ رسول اللہ ﷺ نے معاذ کو یمن بھیجا تو ان سے پوچھا کہ تم کیسے فیصلہ کروگے؟ انھوں نے کہا: میں کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کروگا، آپ ﷺ نے پوچھا: اگر کتاب اللہ میں وہ حکم موجود نہ ہوتو؟ انھوں نے کہا، پھر سنت رسول اللہ کی روشنی میں، آپ ﷺ نے پھر پوچھا: کہ اگر سنت رسول اللہ میں بھی نہ ملے تو؟ انھوں نے کہا کہ پھر میں خود غور کروں گا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: شکر ہے اللہ کا جس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو توفیق بخشی۔

علامہ ناصر الدین البانی نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، لیکن اگر اسے محل استدلال مان بھی لیا جائے تو کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پہلے کتاب اللہ میں دیکھا جائے گا، وہاں نہ ملے تب سنت رسول اللہ پر نظر ڈالی جائے گی۔ اور اگر کتاب اللہ میں مل جائے تو سنت رسول اللہ میں تلاش کرنا ضروری نہیں، علاوہ ازیں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ اگر پورے قرآن کو مروی احادیث ہی کی روشنی میں سمجھنا ہے تو کتاب اللہ میں نہ ملنے کے بعد سنت رسول اللہ سے رجوع کا کیا مطلب؟

اہل تدریس کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ امام ابن تیمیہؒ اوران جیسے علم برداران تفسیر

بالماثور نے تفسیر بالماثور کی جس شدومد کے ساتھ وکالت کی ہے اس کا ایک محل اور پس منظر ہے اور وہ یہ ہے کہ اس عہد تک متعدد کلامی فرقے وجود میں آ گئے تھے جو قرآنی آیات کی اپنے مفاد کے لیے من مانی تاویلیں کرنے لگے تھے۔ اس لیے اس فتنہ کو روکنے کا اس سے زیادہ محتاط کوئی اور طریقہ نہیں تھا کہ لوگوں کو تفسیر بالماثور کا پابند بنا دیا جائے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے ہر قسم کی تفسیر بالماثور کو مطلق حرام قرار نہیں دیا۔

قدیم آسمانی صحیفوں سے استدلال

جہاں تک قدیم آسمانی صحیفوں سے استدلال کا معاملہ ہے تو اس باب میں ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ تحریف سے محفوظ ہیں۔ بلا شبہ ان میں خاصی تحریف ہوئی ہے لیکن ان سے استدلال کی مخصوص نوعیتیں ہیں۔

ایک نوعیت تو یہ ہے کہ قرآن نے جن تعلیمات یا احوال وکوائف کے لیے قدیم آسمانی صُحیفوں کو حوالہ دیا ہے وہ تعلیمات اور احوال وکوائف اب بھی ان کتابوں میں کم از کم ان صورتوں میں موجود ہیں جن سے حقائق کا پتہ لگایا جا سکتا ہے ورنہ قرآن ان کا حوالہ ہی نہیں دیتا، مثلاً سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور جب بات یہاں تک پہنچی کہ قوم موسیٰؑ نے سامری کے فریب میں آ کر گائے کی پوجا شروع کر دی اور حضرت موسیٰؑ نے طور سے واپسی پر قوم کا سخت احتساب کیا اور اللہ سے معافی مانگی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو قوم کے سرکردہ افراد کے ساتھ کوہ سینا پر بلایا۔ اس وقت ایسا زلزلہ بپا کیا کہ معلوم ہوتا تھا سارے لوگ کوہ سینا کے نیچے دفن ہو جائیں گے تو حضرت موسیٰؑ نے نہایت دردمندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کے جواب میں فرمایا:

عَذَابِیْٓ أُصِیْبُ بِهٖ مَنْ أَشَاءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ

یہ میرا عذاب ہے۔ میں اس میں صرف اسی کو مبتلا کروں گا جس کو چاہوں گا اور میری رحمت ہر چیز کو عام ہے سو میں اس کو

بِـآيَـاتِنَـا يُؤْمِنُونَ. الَّـذِيْـنَ يَتَّبِعُوْنَ الـرَّسُـوْلَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَـكْتُـوْبـًـا عِـنْـدَهُمْ فِـىْ التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيْلِ۔ (الاعراف/۱۵۶-۱۵۷)

ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی جس کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

یہاں تورات وانجیل میں مکتوب جس بات کا حوالہ دیا گیا ہے اگر طلبہ کو وہ بات نہ بتائی جائے تو انھیں کس طرح مطمئن کیا جاسکتا ہے؟ اور کیا اس حوالہ سے صرف نظر کر کے تدریس کا حق ادا کیا جاسکتا ہے؟ اس لیے ضروری ہے کہ وہاں تک انھیں پہنچایا جائے، تورات کھول کر دیکھیے تو وہاں کتاب پیدائش میں بنی اسماعیل سے حضرت موسیٰؑ کا یہ خطاب ملے گا۔

> ''خداوند تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا'' [۲۴]۔

حضرت موسیٰؑ سے پہلے کے پیغمبروں نے بھی یہ بات بنی اسماعیل سے کہی تھی، اسی لیے وہ اس پیغمبر کے منتظر بھی تھے اور لوگوں کے درمیان اس کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے ان دعویٰ کی تصدیق ان لفظوں میں فرمائی۔

> ''اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں، میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہ وہی ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا'' [۲۵]۔

اب انجیل کا بیان ملاحظہ کیجیے۔

> ''یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا، یہ

خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے، اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا"۲۶۔

مندرجہ بالا عبارت انجیل متی کی ہے اور انجیل یوحنا میں ہے:

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے"۲۷۔

اسی میں ایک دوسری جگہ ہے۔

"مدرس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں"۲۸۔

تورات اور انجیل کے ان بیانات کی روشنی میں قرآن مجید کے اس حوالہ کو مدلل کیا جاسکتا ہے جس کا ذکر ابھی ہوا۔ اس طرح ہمارے طلبہ جب میدان عمل میں اتریں گے تو اہل کتاب کے سامنے قرآن کے پیغام کو پورے تیقن اور جرأت کے ساتھ پیش کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔

ان قدیم آسمانی صحیفوں سے استدلال کی دوسری نوعیت یہ ہے کہ ان میں تحریف کر کے جن واقعات کو بالکل مسخ کر دیا گیا ہے قرآن کی روشنی میں ان کی تصحیح کی جاسکتی ہے اور اگر ایسا ہو جائے تو جو اہل کتاب ان متضاد بیانات سے تذبذب کا شکار ہیں انھیں مطمئن کر کے قرآن کے آگے سپر انداز ہونے کا موقع فراہم کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ تورات کا ایک تحریف شدہ واقعہ قرآن کی روشنی میں دیکھیے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دعا و مناجات کے بعد جو اولاد ملی تھی اس کا نام اسماعیل تھا اور یہی حضرت اسماعیلؑ ہیں جن کو "ذبیح اللہ" کا خطاب ملا۔ تورات میں بھی حضرت اسماعیلؑ ہی کو ذبیح اللہ قرار دیا گیا تھا لیکن یہود نے اس میں تحریف کر کے حضرت اسماعیلؑ کی جگہ حضرت اسحاقؑ کا نام ڈال دیا تاکہ انھیں ذبیح اللہ کی اولاد ہونے کا شرف

حاصل ہو جائے لیکن اپنی اس شرارت میں بھی وہ ایسے نشانات چھوڑ گئے جن سے ان کی چوری پکڑی گئی۔ تورات کا محرف بیان ملاحظہ کیجیے:

"۱- ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اس سے کہا کہ اے ابرہام! اس نے کہا: میں حاضر ہوں۔

۲- تب اس نے کہا: تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر مریا کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔

۳- تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر اپنے گدھے پر چار جامہ کسا اور اپنے ساتھ دو جوانوں اور اپنے بیٹے اضحاق کو لیا اور سوختنی قربانی کے لیے لکڑیاں چیریں اور اٹھ کر اس جگہ کو جو خدا نے اسے بتائی تھی روانہ ہوا۔

۴- تیسرے دن ابرہام نے نگاہ کی اور اس جگہ کو دور سے دیکھا۔

(اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے مقام قربانی تک آنے اور قربانی کرنے کا ذکر ہے یہاں تک کہ خدا نے ان کو پکارا)

۱۲- اس نے کہا تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اس سے کچھ کر کیوں کہ رب میں جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے۔ اس لیے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا۔

۱۳- اور ابرہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے تب ابرہام نے جا کر اس مینڈھے کو پکڑا اور اسے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا۔

۱۴- ابرہام نے اس مقام کا نام "یھواہ یراہ" رکھا (چنانچہ آج تک یہ کہاوت ہے کہ خداوند کے پہاڑ پر مہیا کیا جائے گا)۔

۱۵- اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ۔

۱۶- خداوند فرماتا ہے: چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ۔

۱۷- میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھانے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی۔

۱۸- اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیوں کہ تو نے میری بات مانی۔

۱۹- تب ابرہام اپنے نوجوانوں کے پاس لوٹ گیا اور وہ اٹھے اور اکٹھے بیر سبع کو گئے اور ابرہام بیر سبع میں رہا[۲۹]۔

تورات کے اس بیان سے حضرت ابراہیمؑ کے بیر سبع سے قربانی کے لیے جانے اور پھر وہیں آ کر اس کو اپنا مستقل مستقر بنا لینے کا ذکر ہے۔ اب تورات کا دوسرا بیان دیکھیے۔

> ’’تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو دیا بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کر کے رخصت کر دیا سو وہ چلی گئی اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی‘‘[۳۰]۔

تورات کے ان دونوں بیانات کو سامنے رکھیے تو پتہ یہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیلؑ ان تینوں کا مسکن بیر سبع رہا اور یہی بیر سبع ہے جہاں سے حضرت ابراہیمؑ بیٹے کو قربانی کے لیے لے گئے اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کو ذبح ہونے سے بچا کر مینڈھا کی قربانی کرائی تو حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو لے کر پھر وہیں بیر سبع میں آ گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس سیاق میں بیٹے سے مراد حضرت اسماعیل نظر آتے ہیں۔ حضرت اسحاق کی قربانی والی بات یکسر غلط معلوم ہوتی ہے۔ پھر تورات ہی میں یہ بھی ہے کہ:

> ’’اور سارہ نے قریت اربع میں وفات پائی۔ یہ کنعان میں ہے اور جرون بھی کہلاتا ہے اور ابرہام سارہ کے لیے ماتم اور نوحہ کرنے کو وہاں گیا‘‘[۳۱]۔

اس بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ہاجرہؓ اور حضرت

اسماعیلؑ کے ساتھ ہی قربانی کے بعد رہتے تھے جب سارہ کا انتقال ہوا تب وہ وہاں گئے۔ اسی طرح تورات کے پہلے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کی۔ اب دیکھیے حضرت اسماعیل پہلے پیدا ہوئے یا حضرت اسحاق؟ تورات ہی میں یہ بھی ہے:

''جب ابرہام سے ہاجرہ کے اسماعیل پیدا ہوا تب ابرہام چھیاسی برس کا تھا''۳۲۔

اسی میں ایک دوسری جگہ ہے:

''جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا''۳۳۔

تورات کے موخر الذکر دونوں بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ پہلے پیدا ہوئے اور حضرت اسحاقؑ ان کے چودہ سال بعد پیدا ہوئے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دی تو ذبیح اللہ حضرت اسحاق کیسے ہو گئے؟

تورات کے ان متناقض بیانات نے خود علمائے یہود کو بھی پریشان کر رکھا تھا اس لیے وہ معترضین کے اعتراضات کا جواب نہیں دے پاتے تھے۔ قرآن نے پوری صورت حال اس طرح واضح کر دی کہ تورات کا تناقض بھی دور ہو گیا اور قدیم علمائے یہود کی تحریف کا پردہ بھی چاک ہو گیا۔ قرآن نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱- حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے نتیجے میں جو بیٹا پیدا ہوا وہ حضرت اسماعیلؑ تھے۔

۲- دعائے ابراہیمی کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے غلام حلیم کی بشارت دی، اس بیٹے کی صفت حلم ہی میں قربانی کا امتحان مضمر ہے۔ کیوں کہ جس بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا تھا اس کے لیے حلم انتہائی ناگزیر تھا، چنانچہ حکم قربانی کے بعد جب باپ نے بیٹے کے سامنے اپنے خواب کا ذکر کیا تو بیٹے نے کمال حلم کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ ابوجان، آپ کو اللہ کی طرف سے جو حکم ملا ہے آپ اسے کر گزریے، آپ انشاء اللہ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔

۳- اس قربانی کے انعام کے طور پر حضرت ابراہیمؑ کو ایک اور بیٹے کی بشارت ملی۔ اس بیٹے کی بشارت کے ساتھ ہی یہ بشارت بھی ملی کہ آنے والا بیٹا نبی ہو گا۔ غور کیجیے

کہ نبوت کی بشارت کے ساتھ اس کی جانی قربانی کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ اور اس حکم قربانی کو ''بلائے مبین'' کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟

۴- حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے اسحاق کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ہی پوتے یعقوب کی بشارت بھی دے دی گئی تھی۔

یہ ساری باتیں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوئی ہیں۔ لیکن صورت حال سمجھنے کے لیے صرف یہ ایک سلسلہ کلام بھی کافی ہے۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصَّالِحِیْنَ. فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِیْمٍ. فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یَا بُنَیَّ إِنِّیْ أَرَی فِیْ الْمَنَامِ أَنِّیْ أَذْبَحُکَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَی قَالَ یَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ. فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِیْنِ. وَنَادَیْنَاهُ أَنْ یَا إِبْرَاهِیْمُ. قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا إِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِیْ الْمُحْسِنِیْنَ. إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِیْنُ. وَفَدَیْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ. وَتَرَکْنَا عَلَیْهِ فِیْ الْآخِرِیْنَ. سَلَامٌ عَلَی إِبْرَاهِیْمَ. کَذٰلِکَ نَجْزِیْ الْمُحْسِنِیْنَ. إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ. وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِیًّا مِّنَ الصَّالِحِیْنَ۔ (الصّٰفّٰت ۱۰۰-۱۱۲)

میرے رب مجھے صالح جانشین عطا فرما دے تو ہم نے اسے ایک بردبار بیٹے کی بشارت دی پس جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچا اس نے کہا: اے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں تو بیٹا تیری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا: ابو جان! وہ کیجیے جو آپ کو حکم ملا ہے۔ انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے پس جب ان دونوں نے حکم الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑا اور ہم نے اس کو پکارا کہ اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا، ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ بے شک یہی کھلی ہوئی آزمائش ہے اور ہم نے اس کو ایک عظیم قربانی کے بدلے چھڑا لیا اور ہم نے اسے بعد والوں میں باقی رکھا، سلامتی ہو ابراہیم پر ہم نیکوں کاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی جو نبی ہونے والا تھا نیکوکاروں میں سے۔

فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِن وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ۔ (ھود/۷۱)	تو ہم نے اس (سارہ) کو خوش خبری دی اسحاق کی اور اس کے پیچھے یعقوب کی۔

قدیم آسمانی صحیفوں سے استدلال کی تیسری نوعیت یہ ہے کہ جو الٰہی تعلیمات آج بھی ان کتابوں میں موجود ہیں قرآن مجید سے ان کی مطابقت دکھا کر یہود و نصاریٰ کو ان کا قائل بنایا جاسکتا ہے۔ یہ دعوت کا ایک ایسا موثر اسلوب ہے جس کی افادیت مسلم ہے۔

یہ تین پہلو خاص طور سے قدیم آسمانی صحیفوں سے استدلال کے ہیں اور جن مفسرین نے قدیم آسمانی صحیفوں سے استدلال کیا ہے عموماً انھوں نے انہی تینوں پہلوؤں کو سامنے رکھا ہے۔ اس لیے تدریس قرآن میں اس پہلو کو لازماً سامنے رکھا جانا چاہیے۔ تا کہ طلبہ پر اس کی آفاقیت واضح ہو سکے۔

عرب کے جغرافیہ اور تاریخ پر نظر

تدریس قرآن میں جغرافیہ و تاریخ عرب کو بھی پوری اہمیت دی جانی چاہیے کیوں کہ جب تک دعوت اسلامی کے مرکز، اس کے ماحول، اس کے حدود اربعہ، وہاں کے باشندوں کے اوصاف خصائل، ان کے علائق و رذائل، ان کی تہذیب و ثقافت، ان کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام، ان کی فطری سادگی، ان کے علاقہ کی معتوب قوموں کے حالات و واقعات اور ان کے فکر و تخیل پر روشنی نہیں ڈالی جائے گی قرآن کے آفاقی اور تاریخی دلائل سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

علمی و تحقیقی منہاج تدریس میں اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہر گلشن علم وادب سے خوشہ چینی کی راہیں باز رہیں البتہ غث و ثمین کی تمیز کا سلیقہ طلبہ کو ضرور بتایا جائے تا کہ وہ ہر ثمین کو پلکوں سے چن کر دل میں اتار سکیں۔

تعلیمی وتذکیری منہاج

جس تدریس میں تذکیر کا پہلو شامل نہ ہو وہ تدریس شجر بے ثمر سے زیادہ اہمیت

نہیں رکھتی۔ اس لیے اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ طلبہ اس حقیقت کو دل سے قبول کریں کہ قرآن کوئی علمی اور تحقیقی کتاب نہیں بلکہ یہ انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ سرچشمۂ ہدایت اور صحیفہ عرفان و آگہی ہے۔ ان کے سامنے یہ پہلو نہایت واضح انداز میں آنا چاہیے کہ اس کتاب رحمت سے عملی تعلق کے بغیر رحمت خداوندی کا حصول ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں چند اصولوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

پہلا اصول

پہلا اصول پاکیزگی قلب ہے۔ پاکیزگی قلب کا مطلب یہ ہے کہ راستے پہلے سے متعین کر کے قرآن سے ان کے لیے دلیلیں نہ ڈھونڈی جائیں بلکہ صاف دل سے پہلے اپنے آپ کو قرآن کے سامنے پیش کیا جائے اور اسی سے معلوم کیا جائے کہ ہمارے راستے کون کون سے ہیں؟ اس عہد مسلکیت اور دور جماعتیت میں اس تذکیری پہلو کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔

دوسرا اصول

دوسرا اصول یہ ہے کہ ہم طلبہ کو بتائیں کہ قرآن کی کچھ باتیں ہماری موجودہ دنیا سے تعلق رکھتی ہیں اور کچھ باتیں اس دنیا سے جس کا علم و مشاہدہ اِس دنیا میں ممکن نہیں تو جو باتیں ہماری موجودہ دنیا سے تعلق رکھتی ہیں اور علم و تجربہ میں آسکتی ہیں ہم ان کی تحقیق کی تو کوشش کریں لیکن جن کا تعلق آخرت سے ہے ان پر ہمارا اجمالی ایمان ہی کافی ہے۔

تیسرا اصول

تیسرا اصول یہ ہے کہ ہم کسی طرح طلبہ کے دل و دماغ میں یہ بات اتاریں کہ قرآن مجید کو پوری توجہ، دلچسپی، دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ پڑھیں اور جتنا پڑھتے چلیں اس پر عمل کرتے چلیں کیوں کہ اس کے نزول کا بنیادی مقصد یہی ہے۔ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ یہی تھا۔ نہ وہ سرسری اور فراٹے والی تلاوت کرتے تھے اور نہ محض اس کی

خواندگی اور غور و تحقیق پر اکتفا کرتے تھے بلکہ اس کی ایک ایک تعلیم کو اپنی زندگی کا حصہ بناتے جاتے تھے۔ ان کے اس منہاج نے ان کی زندگیوں میں ایسا انقلاب برپا کیا کہ وہ جانوروں کی گلہ بانی سے نکل کر انسانیت کی نگہبانی کے مقام تک پہنچ گئے۔

چوتھا اصول

اس کا چوتھا اصول یہ ہے کہ طلبہ کو یہ بتایا جائے کہ اس کی اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی تعلیمات کا تعلق براہ راست ہماری زندگی سے ہے، یہ محض کوئی فلسفہ نہیں ہے بلکہ یہ عملی تجاویز و ہدایات ہیں اور ان تجاویز و ہدایات میں ہر عہد کے لیے رہنمائی موجود ہے۔ اگر عہد نبوی میں کوئی خاص واقعہ پیش آیا اور اس کے حوالہ سے کوئی تعلیم دی گئی تو وہ تعلیم محض اس واقعہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس طرح کے واقعات جب بھی اور جہاں بھی پیش آئیں گے ان میں وہ تعلیم اسی طرح کام دے گی جیسے اُس وقت اس نے کام دیا۔

پانچواں اصول

اس کا پانچواں اصول یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کی روشنی نبی کریم ﷺ کے مکمل اسوہ کو طلبہ کے سامنے کچھ اس طرح رکھ دیا جائے کہ "کان خلقه القرآن" کا مفہوم بالکل واضح ہو جائے اور صاف محسوس ہو کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی قرآن کی عملی تفسیر تھی۔ قاری محمد طیب صاحبؒ نے ان باتوں کو بڑے اچھے انداز میں بیان کر دیا ہے، اسے یہاں نقل کرنا برمحل معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''قرآن میں ذات وصفات کی آیتیں آپ ﷺ کے عقائد ہیں، احکام کی آیتیں آپ ﷺ کے اعمال ہیں، قصص و امثال کی آیتیں آپ ﷺ کی عبدیت ہیں، اخلاق کی آیتیں آپ ﷺ کی حسن معیشت ہیں، معاملات کی آیتیں آپ ﷺ کا حسن معاشرت ہیں، توجہ اِلی اللہ کی آیتیں آپ ﷺ کی حکومت ہیں، تربیت خلق کی آیتیں آپ ﷺ کی جلوت ہیں، قہر و غضب کی آیتیں آپ ﷺ کا جلال ہیں اور مہر و محبت کی آیتیں

> آپ ﷺ کا جمال ...... ترک دنیا کی آیتیں آپ ﷺ کا مشاہد ہیں، احوال محشر کی آیتیں آپ ﷺ کا محاسبہ، نعیم جنت کی آیتیں آپ ﷺ کا شوق اور جحیم نار کی آیتیں آپ ﷺ کا ہم وغم، رحمت کی آیتیں آپ ﷺ کی رجا ہیں اور عذاب کی آیتیں آپ ﷺ کا خوف، انعام کی آیتیں آپ ﷺ کا سکون وانس ہیں اور انتقام کی آیتیں آپ ﷺ کا حزن، حدود و جہاد کی آیتیں آپ ﷺ کا بغض فی اللہ ہیں، نزول وحی کی آیتیں آپ ﷺ کا عروج ہیں اور تعلیم وتبلیغ کی آیتیں آپ ﷺ کا نزول، تنقید و اوامر کی آیتیں آپ ﷺ کی خلافت ہیں اور خطاب کی آیتیں آپ ﷺ کی عبادت، کسی بھی نوع کی آیت ہو وہ آپ علیہ السلام کی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقام نبوت کی تعبیر ہے''[۳۴]۔

اس طرح قرآنی تعلیمات کو سیرت طیبہ کے ساتھ جوڑتے چلیں، اس سے اہل ایمان کے ذوق عمل کو مہمیز ملتی ہے۔ یہ اور اس طرح کے تذکیری پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ قرآنی تعلیمات روضۂ اطہر سے ہوتی ہوئی ہمارے گھروں میں داخل ہو جائیں۔

مدرس کا آئینۂ عمل

تدریس قرآن کے منہاج کا ایک اہم عنصر مدرس کی عملی زندگی ہے۔ ایک مدرس جب ان آیات کی تعلیم وتدریس کا فریضہ انجام دیتا ہے جن میں ایمانیات سے بحث ہوتی ہے تو طالب علم ان آیات کی روشنی میں اپنے استاد اور مدرس کا جائزہ بھی لیتا ہے کہ آیا وہ خود اللہ پر پختہ ایمان رکھتا ہے یا نہیں؟ رسول کی زندگی کو اسوہ تسلیم کرتا ہے یا نہیں؟ خوف آخرت اس کے اندر ہے یا نہیں؟ اسی طرح جب عبادات سے متعلق آیات آتی ہیں تو وہ جائزہ لیتا ہے کہ مدرس قرآن خود نماز کی پابندی کرتا ہے یا نہیں؟ روزوں کا اہتمام کرتا ہے یا نہیں زکواۃ وانفاق کی صفت اس کے اندر ہے یا نہیں؟

اسی طرح اخلاقیات کی آیات آتی ہیں تو وہ ایک ایک کردار کا بڑی باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ استاذ محترم اخلاق کے کس مقام پر فائز ہیں؟ ان کے اندر اخلاق کی کتنی بلندی یا پستی ہے؟

اسی طرح جب معاشرت کی آیات زیر بحث آتی ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ مدرس کا والدین، اولاد اور دیگر اہل خانہ کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے؟

اسی طرح جب معیشت کی بات آتی ہے تو وہ دیکھتے ہیں کہ استاذ مکرم کے معاشی وسائل کس کس قسم کے ہیں۔ اس طرح جب قرآنی سیاست ان کے سامنے آتی ہے تو وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے استاذ کا موجودہ سیاسی نظام سے کس قسم کا تعلق ہے؟ پاکیزہ سیاست کے قیام کے لیے ان کی دلچسپیوں کا کیا حال ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

گویا ایک طالب علم اپنے مدرس کے آئینۂ عمل میں اپنی تصویر دیکھتا ہے اور خود قرآن کے آئینہ میں مدرس کی تصویر دیکھتا ہے۔ اگر مدرس باکردار ہو تو قرآنی تعلیمات طلبہ پر جادو کا اثر کرتی ہیں لیکن اگر مدرس کا کردار صحیح نہیں ہے تو طلبہ باکردار نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کی تدریس میں جہاں علمی و تحقیقی منہاج کو اہمیت حاصل ہو وہیں تعلیمی و تذکیری پہلو کو بھی اہمیت دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ مدرس قرآن کی عملی زندگی بھی ان قرآنی تعلیمات کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہو۔

حواشی و مراجع

۱ اس تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو للامام الزرکشی، **البرھان فی علوم القرآن**، بحث شان نزول، مقدمہ تفسیر نظام القرآن للامام الفراہی، مقدمہ تفسیر تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی اور مقدمہ تفسیر تفہیم القرآن، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

۲ القرطبی، **الجامع لاحکام القرآن**، ج۱۰، ص۱۱۰، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۹۶۶ء، یہ ہدایت حضرت عمرؓ کی ہے۔

۳ السیوطی، **الاتقان فی علوم القرآن**، بحوالہ تفسیر الطبری، ج۱، ص۲۵۱، یہ قول مشہور مفسر قرآن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا ہے۔

۴ اسد الغابہ فی تذکرۃ الصحابہ، ذکر عبادۃ بن ثابت، ج ۳، ص ۱۰۶، مطبع رہبیہ مصر، ۱۲۸۰ھ

۵ مولانا ریاست علی ندوی، اسلام نظام تعلیم، معارف پریس دار المصنفین، اعظم گڑھ، ص ۳۵ تا ۳۸

۶ ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، محمد احمد عیسوی، تفسیر ابن مسعود، ج ۱، ص ۵۵ تا ۵۷، طبع اول ۱۴۰۵ھ۔ شرکۃ الطبعۃ السعودیۃ العربیۃ، السیوطی: الاتقان فی علوم القرآن، ص ۷۲۵ تا ۸۵۳، دار البیروت ۱۴۲۵ھ، مصطفیٰ الصاوی الجوینی، مناہج فی التفسیر منشأ، المعارف اسکندریۃ، ص ۳۷ تا ۳۹

۷ خاکسار کا ایک مستقل مضمون اسی موضوع پر ہے جو سہ ماہی رسالہ نظام القرآن مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کی ج ۱، ش ۱ میں شائع بھی ہوچکا ہے اس میں قرآنی استعمالات، احادیث، لغات اور کلام عرب سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا یہی معنیٰ درست ہے۔ عام طور پر مفسرین نے اس کا جو معنیٰ بیان کیا ہے اس کی نہ کوئی نظیر قرآن میں ہے نہ احادیث میں، نہ لغات میں اور نہ کلام عرب میں ح

۸ الامام بدر الدین الزرکشی، البرہان فی علوم القرآن، مکتبۃ دار التراث القاہرہ، ج ۳، ص ۷۸

۹ ایضاً

۱۰ اس طرح کے اسالیب کو جاننے کے لیے مولانا حمید الدین فراہی کی کتاب اسالیب القرآن انتہائی مفید کتاب ہے۔

۱۱ ملاحظہ ہو: ABRAHAM GEIGER, *JUDAISM AND ISLAM* MADRAS, pp.19-20

۱۲ مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی، قرآنی مقالات، ادارہ علوم القرآن علی گڑھ، ص ۱۳۷-۱۳۸

۱۳ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون ''تاویل آیات کا فراہی منہاج''، ششماہی علوم القرآن علی گڑھ، خصوصی مقالات سیمینار ''قرآنی علوم بیسویں صدی میں'' ص ۱۰۵-۱۰۶

۱۴ ابن جریر طبری نے پہلی تاویل ہی کو ترجیح دی ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر طبری۔ سورۂ یوسف۔

۱۵ حوالہ سابق

۱۶ خاکسار نے ستائیسویں اور اٹھائیسویں پارے کی بیش تر سورتوں پر اسی طرح کے مضامین لکھے ہیں جو سہ ماہی نظام القرآن مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے جلد ۳ سے جلد ۸ تک میں شائع ہوچکے ہیں۔

۱۷ بیان کرنے والے حضرت انسؓ، حضرت عکرمہ اور حضرت حسن ہیں۔ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، ہندی نسخہ، ص ۹۷

۱۸ **الصحیح لمسلم**، کتاب الایمان، باب قول اللہ عزوجل ’’**ولقد رأہ نزلة أخری وہل** رأی النبی ربہ لیلة الإسراء‘‘۔

۱۹ **الصحیح للبخاری**، کتاب الجنائز، باب قول النبی ﷺ **یعذب المیت ببعض بکاء اہلہ** علیہ إذا کان النوح من سنتہ و**الصحیح لمسلم**، کتاب الجنائز، باب المیت یعذب ببکاء اہلہ علیہ۔

۲۰ **مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ**، دارالعربیۃ، بیروت ۱۳۹۸ھ، ج ۱۲، ص ۳۷۰

۲۱ حوالہ مذکور، ص ۳۷۱، ۳۷۴

۲۲ حوالہ مذکور

۲۳ **السنن للترمذی**، باب ماجاء فی القاضی، کیف یقضی - **السنن لأبی داؤد**، باب مذکور

۲۴ تورات، کتاب پیدائش، باب ۱۵، بحوالہ تفسیر تدبر قرآن، متعلق آیات کی تفسیر

۲۵ ایضاً، باب ۱۹، بحوالہ مذکور

۲۶ انجیل متی، باب ۲۱، ۴۲، ۱۴، بحوالہ مذکور

۲۷ انجیل یوحنا، باب ۱۴، ۱۷، بحوالۂ مذکور

۲۸ ایضاً، باب ۱۴، ۳۱، بحوالۂ مذکور

۲۹ تورات: کتاب پیدائش، باب ۱، ۱۹، بحوالہ علامہ حمید الدین فراہی، ذبیح کون ہے؟، ناشر دائرہ حمیدیہ، سرائے میر، ۱۹۹۹ء، ص ۳۴، ۳۵

۳۰ ایضاً، باب ۲۱، ۱۴، بحوالۂ مذکور

۳۱ ایضاً، باب ۲۳:۲، بحوالۂ مذکور

۳۲ ایضاً، باب ۱۶:۱۶، بحوالۂ مذکور، ص ۴۱

۳۳ ایضاً، باب ۲۱:۵، بحوالۂ مذکور

۳۴ خطباتِ حکیم الاسلام، قاری محمد طیبؒ (قرآن کی عملی تفسیر)، حکیم الاسلام اکیڈمی، دیوبند، ۱۹۸۴ء، ۱/۲۴۷-۲۴۸

☆☆☆